اکائی نمبر 26: ترقی پسند تحریک

ساخت

26.1: اغراض و مقاصد
26.2: تمہید
26.3: ترقی پسند تحریک
25.3.1: اردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات
26.4: آپ نے کیا سیکھا
26.5: اپنا امتحان خود لیجیے
26.6: سوالوں کے جوابات
26.7: کتب برائے مطالعہ

26.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ

- ترقی پسند تحریک کا جائزہ لیں گے۔
- ترقی پسند تحریک کے علمبر داروں پر نظر ڈالیں گے۔
- اردو ادب پر پڑنے والے ترقی پسند تحریک کے اثرات سے واقف ہوں گے۔
- ترقی پسند شعرا و ادبا سے متعارف ہوں گے۔

26.2 تمہید

ترقی پسند تحریک کا آغاز1935 میں ہوا۔ سجاد ظہیر، ملک راج آنند اور جیوتی گھوش نے انجمن کے قیام میں حصہ لیا۔ ان لوگوں کے پیش نظر یوروپ کا اقتصادی بحران، جرمنی میں نازی پارٹی کی چیرہ دستی، نچلے طبقے کے مسائل، فرانس میں مزدوروں کی بیداری اور آسٹریا کے مزدوروں کے ناکام انقلاب کا نقشہ تھا۔انھوں نے جو مینی فیسٹو تیار کیا اس کا پریم چند بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ اس تحریک کا مقصد تھا کہ ادب جو اعلیٰ طبقے کے زیر اثر ہے، عوام تک پہنچایا جائے اور اُسے حقیقت پسندی سے روشن کر دیا جائے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے چند تجاویز پیش کیں جن میں ہندستان کے مختلف صوبوں میں ادیبوں کی تنظیمیں قایم کرنا، ان ادیبوں اور شاعروں پر اسکی اہمیت واضح کرنا جو اس کے مخالف تھے اور ترقی پسند ادب کی تخلیق کرنا یا ترجمے پیش کرنا شامل تھیں۔ترقی پسند مصنفین نے آزادی، جمہوریت پسندی اور انسان دوستی پر زور دیا تھا۔اسی زمانے میں افسانوں کے مجموعے''انگارے'' کی

اشاعت عمل میں آتی ہے۔ حکومت نے ضبط کر لیا۔ ترقی پسند ادب نے عقلیت اور حقیقت پسندی پر زور دیا۔ اس نے ادب کے تمام شعبوں کو متاثر کیا۔ حقیقت پسندی کی جڑیں فرائڈ کے جنسی تجزیے تک سے جا ملیں تھیں۔ کیونکہ ترقی پسند تحریک میں ایک عوامی اپیل تھی جو وقت کا تقاضہ تصور کی جاتی تھی اس لئے بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ نوجوان نسل بھی ترقی پسند تصورات سے خود کو ذہنی طور پر ہمہ آہنگ پاتی تھی۔ بعض لوگوں کا تعلق مختلف مکاتیب خیال سے تھا لیکن ادبی معاملے میں وہ ترقی پسند نظریات کے قابل تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اردو نظم، اردو افسانہ و ناول اور تنقید وغیرہ پر اپنے اثرات مرتسم کئے اور ان مختلف اصناف میں خاصہ سرمایہ تخلیق کیا۔ ترقی پسندوں نے آزادی کی تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جب آزادی مل گئی تو ان کی آواز کمزور پڑ گئی۔ ملک تقسیم ہو گیا اور اس تحریک کے بعض موئلد سرحد کے دوسرے پار چلے گئے۔ ترقی پسند تحریک کی کمیونسٹ ہونے کی شرط نے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

26.3 ترقی پسند تحریک

انسانوں کی طرح تحریکات کی بھی اپنی ایک عمر ہوا کرتی ہے، بالخصوص ادبی تحریک کی۔ اور یہ سچ ہے کہ کسی بھی ادبی تحریک یا رجحان کی عمارت محض ادبی اقدار کی بنیادوں پر زیادہ دیر تک کھڑی نہیں رہ سکتی۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا تعلق سماجی و ثقافتی اقدار سے ہوتا ہے اور مخصوص بحرانی و انتشاری ماحول میں سیاسی افکار و اقدار سے بھی۔ یہ وہ فکری اور فطری عمل ہے جو مختلف و متضاد خیال اور فکر کے دانشوروں کو ایک محاذ پر لا کھڑا کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

آخر کیا وجہ تھی کہ 36-1935ء میں جب سجاد ظہیر نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی تو اس عہد کے اکابرین ادب اور سماجی دانشوروں نے اپنے اپنے انداز اور نقطۂ نظر سے انجمن کی حمایت اور سرپرستی کی، جو دیکھتے دیکھتے تحریک کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ سجّاد ظہیر لکھتے ہیں:

> ''ہندستان میں جب ہم نے 1935ء کے آخر میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی تنظیم شروع کی تو ملک کی آزادی خواہ رہنماؤں خاص طور پر بائیں بازو کے رہنماؤں ہمارے چند بزرگ ترین ادیبوں اور نوجوانوں، دانشوروں نے عام طور پر ہماری تحریک کا خیر مقدم کیا۔ ہمارا دل بڑھایا اور ہماری مدد کی۔ پریم چند ہماری انجمن میں شریک ہوئے اور انھوں نے ہماری کل ہند کانفرنس کی صدارت کی۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے ہماری کل ہند کانفرنس کے لئے استقبالیہ لکھا جو کانفرنس میں پڑھا گیا۔ ان کے علاوہ جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، سمتر انندن پنت، آنند نرائن ملاّ، آچاریہ نریندر دیو، سروجنی نائڈو ہماری کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔ جواہر لال نہرو نے کئی پیغامات بھیجے۔ اور ایک مرتبہ الہ آباد میں منعقد ہندی اور اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں شریک ہو کر تقریر بھی کی''۔
>
> (ترقی پسند ادبی تحریک کے تیس سال)

ایسا اس لئے ہوا کہ تنظیم کے جو اغراض و مقاصد تھے وہ اس وقت کی سیاسی اور سماجی فضا سے پورے طور پر ہم

آہنگ تھے۔ تبدیلی انسانی فطرت کا بنیادی حصہ ہے۔ تاریخ بھی انھیں جدلیاتی بنیادوں پر کروٹ لیتی ہے۔ غالبؔ، حالیؔ، اقبالؔ، پریم چندؔ، جوشؔ وغیرہ نے بھر پور ادبی فضا تیار کر رکھی تھی۔ لیکن اس سے زیادہ اثر پڑا اس وقت کی عالمی سیاست اور سماجی اتھل پتھل کا جسے سجّاد ظہیرؔ لندن میں رہتے ہوئے بالعموم اور پیرس میں ادیبوں کی عالمی کانفرنس میں بالخصوص اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے تھے۔ اور یہ خیال ان کے شعور میں جگہ پا چکا تھا کہ ظالم حاکم وقت سے شاعر و ادیب کس طرح لڑائی لڑ سکتے ہیں۔ معاشرہ کی صحت وتعمیر میں ان کا کس طرح رول ہو سکتا ہے۔ ہندستان میں آزادی کی لڑائی پورے شباب پر تھی دیکھتے دیکھتے تنظیم نے تحریک کی شکل اختیار کر لی اور ترقی پسند تحریک بقول ظہیرؔ کاشمیری: ''متحدہ محاذ کا پلیٹ فارم بن گئی''۔ اس میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ مارکسسٹ بھی، ڈیموکریٹ بھی، محبّ وطن بھی۔ لیکن ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو سماج کو بہتر لائنوں پر چلانا چاہتے تھے اور سماج کی پرانی غیر استدلالی روایتوں کے خلاف جنگ لڑنا چاہتے تھے۔ بہر حال ایک متحدہ محاذ تھا لیکن ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندستان کے معاشرے کا جو ڈھانچہ ہے اس میں انقلابی تبدیلی آنی چاہیے۔ فراقؔ گورکھپوری جو تحریک کے ابتدائی معماروں میں سے رہے ہیں انھوں نے بھی ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ تحریک کی کامیابی کی دو بڑی وجہیں تھیں، ایک تو اسے سجّاد ظہیرؔ جیسا بانی ملا، دوسرے یہ ایک ایسا پودا تھا جو صحیح موسم میں صحیح جگہ لگایا گیا تھا اسی لئے بار آور ہوا۔ چناچہ آپ اگر 35ئسے لے کر 47ء تک کا تخلیقی ادب ملاحظہ کریں تو اس میں آزادی کی تڑپ، نابرابری کی چبھن، آزاد فضا میں پرواز کی امنگ، معیارِ حسن میں تبدیلی،نظریاتی جدوجہد، معاشرتی مسائل وغیرہ زیادہ بکھرے نظر آئیں گے۔ غرض کہ تحریک نے ایک تاریخ ترتیب دیا اور آزادی کا حسین تحفہ ہاتھ آیا۔ پھر انگریز چلے گئے لیکن جاتے جاتے وہ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر گئے۔ فسادات ہوئے، آبادی تقسیم ہوئی اور دیکھتے دیکھتے سماج اور معاشرہ کی اسکرین پر مناظر ایکدم سے بدل گئے اور پھر بدلتے چلے گئے۔ آزادی حاصل ہوئی تو اس کے تحفظ کا مسئلہ پیدا ہوا۔ نئے سماج میں نئے سماج کے ساخت کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ صدیوں کے نظام کی ٹوٹن نے ایک عجب کرب آمیز انگڑائی لی۔ادھر ترقی پسند ادیبوں و دانشوروں میں بھی مسائل و اختلاف پیدا ہوئے کہ فرد اور سماج بہر حال لازم وملزوم حیثیت رکھتے ہیں۔

اسی مقام پر کچھ دیر دم لے کر ٹھنڈے دل و دماغ سے نئے مسائل اور نئے تقاضوں کی روشنی میں ترقی پسند ادیبوں کی ایک نیا لائحہ عمل تیار کرنا چاہئے تھا لیکن شاید ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس ادب اور سیاست کے تمام رشتوں و نزاکتوں کو بالائے طاق رکھ کر انجمن نے 49ء کی بھیمڑی کانفرنس میں اپنے انتہا پسندانہ منشور کی وجہ سے ایک سیاسی حیثیت دے دی اور بھول گئے کہ یہ انجمن، یہ تحریک بنیادی طور پر ادبی تحریک تھی اور ادب اور سیاست کا خواہ کتنا گہرا تعلق کیوں نہ ہو دونوں کے معیار و اقدار الگ الگ ہوتے ہیں۔ بہر حال محاذ بکھرنے لگا اور دیکھتے دیکھتے غیر مارکسی یا غیر سیاسی ادیب اس سے الگ ہونے لگے۔ چھوٹے چھوٹے اختلافات بڑا روپ لینے لگے اور چودہ پندرہ برس کا خوبصورت، تاریخی اور یادگار سفر گزار کر تنظیم و تحریک تعطل کا شکار ہوگئی۔

تین چار برس کا یہ وقفہ تنظیم کے لئے بیحد صبر آزما تھا۔ ادھر ترقی پسند ادیبوں میں خاموشی کام کرنے لگی، ادھر سجّاد ظہیرؔ پاکستان چلے گئے چنانچہ 1935ء میں جب انجمن کی کانفرنس دہلی میں ہوئی اور اس میں منشور میں تبدیلی

کی گئی، لیکن اس وقت تک دیر ہو چکی تھی اور پھر یہ بھی ہوا کہ کرشن چندر تنظیم کے جنرل سکریٹری چنے گئے، جنھوں نے اس کو فعال بنانے میں ذرا بھی دلچسپی نہ دکھائی لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آزادی کے بعد ہندستانی سماج کے سامنے بظاہر کوئی بڑا مقصد حیات نہ تھا اور شاید نظریۂ حیات بھی نہیں اسی لئے وہ چھوٹے چھوٹے علاقائی ، مذہبی اور ذات پات کے مسائل میں الجھ گئے اور ہندستان کے بوسیدہ سماجی نظام کے بطن سے ایک نئی محدود و مجوس سیاست جنم لینے لگی۔ یہی وہ دور ہے جب جدیدیت اپنے انخلاء و انتہا پسند رویہ کے ساتھ سر اٹھاتی ہے، جس کا مقصد اپنا ایک الگ ادبی نظریہ پیش کرنا کم، ترقی پسندی کی مخالفت زیادہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ 54ء کے بعد کی مئوناتھ بھنجن کانفرنس بھی تقریباً ناکام ہوئی۔ انھیں برسوں میں تنظیم کے بزرگوں نے انھیں صورتوں کے پیش نظر اس کے خاتمہ کا اعلان کر دیا لیکن وہی سجّاد ظہیر 1966ء میں دہلی میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس بلاتے ہیں اور خود جنرل سکریٹری کا عہدہ سنبھالتے ہیں۔ اس کانفرنس میں عرصہ کے بعد نو جوان ادیبوں کی اچھی خاصی تعداد شریک تو ہوئی لیکن صورتِ حال بہت زیادہ امید افزانہ بن سکی۔ اس درمیان ہندستان کی ادبی فضا میں بالعموم اور اردو ادب میں بالخصوص نمایاں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ اردو ادب دو متوازی دھاروں میں تقسیم اپنی اپنی راہیں طے کر رہا تھا اور نئی فضا تیار کر رہا تھا۔ایک طرف تو وہ نوجوان جو فیشن یا محدود نقطۂ نظر کے ساتھ ترقی پسندی سے منسلک ہوئے تھے دھیرے دھیرے اس سے الگ ہونے لگے۔مظہر امام نے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> ''یہ صحیح ہے کہ نئی نسل کے بہت سے معتبر شعراء ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ اس تحریک سے ان کا انحراف تحریک کی سخت گیری، انتہا پسندی، ادعائیت اور سیاسی روش کے باعث تھا ورنہ ترقی پسندی کی صحت مند روایت سے وہ برگشتہ نہ تھے۔ جب انھوں نے محسوس کیا کہ ایک مخصوص سیاسی نظریے کے تحت اجتماعیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے تو وہ ترقی پسندی سے دل برداشتہ ہو گئے''۔ (ترقی پسندی سے جدیدیت تک)

حالانکہ جو لوگ دل برداشتہ ہوئے وہ اپنے مزاج میں بھی انتہا پسند تھے۔ چنانچہ آگے چل کر ان کی ادبی حیثیت ادھر کی رہی نہ ادھر کی۔درمیان میں جدیدیت کا بے ہنگم شور وغل تنظیم وتحریک کے لئے نیک فال ثابت ہوا۔ دوسری طرف قومی اور بین الاقوامی سیاست اور سماج نے ایک بار پھر ترقی پسند ادیبوں کی حمیت کو للکارا اور جوش دلایا۔ بقول قمر رئیس:

> ''تیزی سے بدلتے ہوئے بین الاقوامی حالات اور آزاد ہندستان ہیں زندگی کے نئے تقاضے نئے خطوط پر ادیبوں کی تنظیم کا مطالعہ کر رہے تھے۔ نوجوان ادیب جدیدیت کی تحریک سے (جس کا مقصد ترقی پسند نظریۂ ادب اور افکار کی بیخ کنی تھا) مایوس ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے نئے چیلنج، نئے سوالات، نئی ذمہ داریاں تھیں اور ایک ایسے فورم کی تلاش جہاں وہ ان کے بارے میں کھل کر گفتگو کر سکیں''۔ (مقدمہ، ترقی پسند ادب)

ایسی صورتِ حال میں نوجوان ترقی پسند ادیبوں کا گروپ جو کچھ دنوں قبل احتشام حسین، آل احمد سرور، محمد حسن وغیرہ کی سرپرستی میں لکھنؤ میں ترقی پسند فکر و خیال کی ایک نئی شمع جلا رہا تھا۔ ان نوجوانوں میں قمر رئیس، اقبال

مجیدؔ، آغا سہیلؔ، عابد سہیلؔ، رتن سنگھ، احمد جمال پاشا وغیرہ خاص تھے۔ ہر چند کہ ان تمام حضرات نے آگے بڑھ کر اپنے اپنے میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور ترقی پسند ادب ونظریہ کے احیاء میں غیر معمولی کردار ادا کیا لیکن تنظیم وتحریک کے تعلق سے ان میں سب سے اہم نام قمر رئیسؔ کا ہے، جو ابتدا سے ہی نہ صرف ترقی پسند ذہن کے مالک تھے بلکہ اشتراکیت، مساوات اور صحت مند رجحان ونفسیات کی وجہ سے ابتدا سے ہی اس تنظیم کی طرف راغب رہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ دہلی آئے تو 66ء کی ترقی پسند کانفرنس میں پہلی بار قمر رئیسؔ نے باقاعدہ مقالہ پڑھا اور اس بات پر زور دیا کے نئے حالات میں انجمن کی بہر حال ضرورت ہے، لیکن انجمن میں نئے لوگوں کو زیادہ جگہ ملنی چاہئے۔ اس سلسلے میں دہلی میں ان کا ساتھ دیا حسن نعیم، انوار عظیم، اجمل اجملی وغیرہ۔ سجّاد ظہیرؔ زمانہ شناس تھے انھوں نے ان نوجوانوں کے جوش و جذبہ کو پڑھ لیا اور قمر رئیسؔ سے کہا، آپ لوگ آگے آیئے ہم لوگ پیچھے ہیں۔ چنانچہ اب انجمن کی باگ ڈور قمر رئیس کے ہاتھوں میں تھی۔ ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

''ستمبر 72ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے کرنے شروع کئے جن میں شرکاء کی تعداد بڑھتی گئی اس طرح کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک ایسی تنظیم وجود میں آئی جس کے عہدہ داروں کی اکثریت کسی سیاسی جماعت کی رکن اور وفادار نہیں ہے لیکن اس تنظیم سے وابستہ ادیبوں پر پابندی بھی نہیں کہ وہ کسی سیاسی جماعت کی رکنیت اختیار نہ کریں۔ اس تنظیم کا نہ کوئی باضابطہ دستور ہے اور نہ منشور البتہ اس کے ادیبوں کی طرف سے ایک اعلانیہ ضرور شائع ہوتا ہے جس میں انسان دوستی، امن خواہی کے وسیع تر نقطۂ نگاہ سے انسانیت کو درپیش مسائل کے بارے میں ادیبوں کے موقف کی وضاحت کی جاتی ہے''۔

قمر رئیسؔ نے انتہائی غور وفکر اور سوجھ بوجھ کے ساتھ انجمن کی ذمہ داریاں سنبھالیں اس لئے کہ تنظیم وتحریک کے تعلق سے یہ بہت نازک دور تھا۔ ایک طرف تحریک اور اس کے فکر وفلسفہ ہزار مخالفت کے باوجود پوری ادبی فضا میں تحلیل ہو چکے تھے اور اس کے مخالفین شعوری یا غیر شعوری طور پر کہیں اس سے متاثر اور کہیں اس سے مرعوب ہو کر اپنے انداز سے سفر طے کر رہے تھے۔ ماضی قریب میں سیاست ادب کے گلے لگ کر اپنا تاریخی رول ادا کر چکی تھی۔ اب فطری اور نفسیاتی تقاضا تھا کہ نوجوانوں کی تحریک اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے ایک نئے انداز سے ایک نئے زاویے سے شعر و ادب کے تخلیقی سفر طے کرے۔ تحریک نت نئے تقاضوں اور تبدیلیوں کی فطری ڈیمانڈ کے ساتھ ایک نئی ڈگر پر چلنے کے لئے بیتاب تھی۔ اس نازک موڑ پر قمر رئیسؔ اور ان کے ساتھیوں نے مارچ 1973ء میں ادب اور عصری آگہی کے عنوان سے ایک سیمینار کا اہتمام کیا جس میں پورے ہندستان کے ترقی پسند ادیبوں نے شرکت کی اور آزادی کے بعد اردو ادب کا ازسرِ نو جائزہ لیا گیا۔ یہ جائزہ اس قدر معروضی، علمی اور استدلالی تھا کہ سجّاد ظہیرؔ نے باقاعدہ اس سیمینار کی رپورٹ تیار کی۔ اسی رپورٹ میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''قطع نظر اس کے ان مقالوں اور مباحث سے مجھے اتفاق تھا یا بحیثیت مجموعی یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ سیمینار کا علمی، تحقیقاتی، نظریاتی اور تہذیبی معیار بیحد بلند تھا۔ بیشتر مقالے غور وفکر اور تفتیش اور

محنت کر کے لکھے گئے تھے۔۔۔۔جنھیں سن کر محسوس ہوا کہ زمانہ حال کے اردو ادب اور اس کے مختلف نظریاتی رجحانات ترقی پسند نقطۂ نظر اور اس کے مخالف نظریات اور موجودہ ادبی تخلیقات کی خوبیوں اور کمزوریوں کے متعلق ہمیں زیادہ واقفیت حاصل ہو رہی ہے۔ ان مقالوں اور بحثوں کو سن کر یہ بھی احساس ہوتا تھا کہ ادبی نظریات کے تضادات اور مختلف اسالیب اور ہیئتی اختلافات کے تجزیے اور تشریح کے ذریعہ ہمارے ادبی شعور میں مجموعی طور سے زیادہ گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی اور فی الجملہ ترقی پسند ادب کو کئی نہج سے فروغ دینے اور اسے بہتر بنانے کے لئے خود اعتمادی اور نیا حوصلہ ہوا۔''

(کتاب، ضولائی ۴۷ء)

نوجوانوں کو نوازنے اور ان کی ہمت افزائی کرنے کے بعد سجاد ظہیر 13 دسمبر 1973ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے، لیکن تحریک کی باگ ڈور مضبوط ہاتھوں میں سونپ گئے، جن میں سب سے مضبوط ہاتھ قمر رئیس کا تھا۔

1976ء میں تحریک کا چالیس سالہ جشن منایا گیا۔ کل ہند کانفرنس ہوئی، جس میں علی سردار جعفری صدر اور قمر رئیس جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ قمر رئیس نے انجمن کے بینر سے رسالہ عصری آگہی بھی نکالا جس کے مضامین اور اداریوں میں اس عہد کی ادبی و سماجی صورتوں کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

1980ء میں پریم چند کی صدی اور 1986ء میں ترقی پسند تحریک کی صدی پوری اردو دنیا میں تزک و احتشام سے منائی گئی۔ یہ وہ دور تھا جب ایک حلقہ سے تحریک کے خاتمہ کا اعلان ہو رہا تھا اور پورے ترقی پسند ادب کو نعرہ بازی کا ادب، خطابت و خارجیت کا ادب کہہ کر راندۂ درگاہ کیا جا رہا تھا اور پریم چند کے بارے میں بعض جدید نقادوں کا یہ کہنا تھا کہ اردو کے افسانوی ادب کو سب سے زیادہ نقصان پریم چند نے پہنچایا۔ اسی لئے انجمن کی طرف سے پریم چند کی صدی اور تحریک کی صدی کا منایا جانا علامتی طور پر ضروری تھا۔ سو یہ کام بخوبی ہوا، لیکن کچھ سوال بہر حال قائم تھے۔

ممتاز دانشور مرحوم سبط حسن سے آخری دنوں میں میں نے ایک سوال کیا تھا کہ ترقی پسندی کی آواز دھیمی کیوں پڑتی جا رہی ہے؟ وابستگی اتنی کمزور کیوں ہوتی جا رہی ہے؟ تو انھوں نے فرمایا تھا:

''گذشتہ کئی دہائیوں میں ترقی پسندی کا بڑا پروپگنڈا ہوا۔ سچ یہ ہے کہ جب اس کی ضرورت تھی تو فطری طور پر ادب نے اپنے آپ میں اسے جذب کر لیا اور اب تو وہ پوری ادبی فضا میں تحلیل ہو چکی ہے لیکن جہاں ہمیں نئے تقاضوں کے تحت فکری تبدیلی برتنا چاہئے تھا وہ نہیں برتی، چنانچہ اس کا ردّ عمل ہوا۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنے ایک مضمون ''شاعری کا سماجی منصب'' میں ایک بات پتے کی کہی ہے۔ ''ہمارا شعور و ادراک جیسے جیسے ہمارے گرد وپیش کی دنیا بدلتا ہے خود بھی بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً ہمارا شعور و ادراک وہ نہیں ہے جو چینیوں کا ہندوؤں کا تھا، بلکہ وہ اب ویسا بھی نہیں ہے جیسا کئی سو سال قبل ہمارے اجداد کا تھا۔ یہ ویسا بھی نہیں ہے جیسا ہمارے باپ دادا کا تھا بلکہ ہم خود بھی وہ شخص نہیں ہیں جو ایک سال پہلے تھے۔''

ایلیٹ کی اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ نئے زمانہ کے تناظر میں نئی ترقی پسندی یا ترقی پسندی کے نئے

رجحانات کی تلاش و شناخت کریں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ نہ تو ترقی پسندی کی پہچان کی ضرورت ہے اور نہ ہی کمٹ منٹ کے بارے میں زیادہ الجھنے کی۔ ترقی پسندی غزل ہے نہ افسانہ، جس کے نئے اور پرانے پر ہم بحث کریں۔ ترقی پسندی کے بندھے ٹکے اصول و ضابطے نہیں ہوا کرتے اور نہ ہی یہ کوئی سیاسی نظریہ یا نظام کا نام ہے۔ اگر کچھ دنوں تک ایسا کوئی نام دئے جانے کی کوشش کی گئی تو یہ چند لوگوں کا اپنا نظریہ ہو سکتا ہے، کلیہ نہیں۔ اصل ترقی پسندی تو شعور و ادراک، محبت اور بصیرت سے پیدا ہوتی ہے اور یہ اوصاف اپنے عہد کی معرفت سے حاصل ہوتے ہیں۔ ہر عہد کے اپنے مخصوص رجحانات ہوتے ہیں۔ ان کی شناخت، واقفیت اور گرفت ہی فنکار کا نام ہوتا ہے اور اس کے فنکارانہ فرائض کا تخلیقی اظہار، اس اظہار کے راستے مختلف ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ تخلیقی سطح پر ہر فنکار کی اپنی ایک منزلِ مقصود ہوا کرتی ہے۔ اور اس منزل تک پہنچنے کے لئے جو راستہ اپنایا جاتا ہے اسی کو ہم نظریہ کہتے ہیں۔ بقول اصغر علی انجینئر:

> ''نظریہ منزلِ مقصود کے حصول کا اہم راستہ ہوتا ہے اور اس کی نشاندہی بھی کراتا ہے۔ گویا نظریہ اور اس کے مقصود میں ایک طرح سے جدلی رشتہ ہوتا ہے۔''

کہا جاتا ہے کہ ہر دور کا نمائندہ ادب اپنے دور کے نمائندہ رجحانات اور مسائل سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح ادیب اور زمانہ، ادب اور معاشرہ کے اندرونی رشتے گہرے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ ان رشتوں کی نزاکتیں جتنی عجیب ہوتی ہیں اس سے زیادہ عجیب، دلچسپ اور معنی خیز اظہار ہوتا ہے۔ دورِ حاضر میں اس کی کئی مثالیں ہیں۔ مثلاً ندا فاضلی جنھوں نے کبھی ''سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا''۔ جیسے مبہم مصرعے کہے تھے، آج اس نوع کی غزل کہہ رہے ہیں:

ہر ایک گھر میں دیا بھی جلے اناج بھی ہو
جہاں نہ ہو کہیں ایسا تو احتجاج بھی ہو
حکومتوں کو بدلنا تو کچھ محال نہیں
حکومتیں جو بدلتا ہے وہ سماج بھی ہو

شب خون اپریل 2005ء میں شائع شدہ ان کی غزل جدیدیت اور شب خون دونوں کے بارے میں کئی سوالات قائم کرتی ہے۔ دو شعر اس غزل کے بھی ملاحظہ کیجئے:

یہ دل کٹیا ہے سنتوں کی یہاں راجہ بھکاری کیا
وہ ہر دیدار میں زردار ہے گوشہ کناری کیا
کسی گھر کے کسی بجھتے ہوئے چولھے میں ڈھونڈ اس کو
جو چوٹی اور داڑھی تک رہے وہ دین داری کیا

ان میں بالکل نئے شعراء کے چند اشعار پیش کرتا ہوں:

مرے ثبوت بہے جا رہے ہیں پانی میں
کسے گواہ بناؤں سرائے فانی میں(فرحت احساس)

ازل سے یہی دستور دنیا کا رہا ہے
جسے جینا تھا وہ مرنے پہ اکسایا گیا ہے(حیدر نقوی)

پاؤں میں باندھ کے نکلے ہیں بھنور کی زنجیر
اگر ہے جینا تو جینا محال کرتے رہو(شکیل اعظمی)

دنیا اسیر حرص و ہوس اور ہمیں یہ فکر
لوگوں کے بیچ رشتۂ جاں کس طرح بنے(شہنواز شبلی)

اے چراغ عزم تیری لو سلامت
پاؤں اکھڑیں گے ہوا کے دیکھتے ہیں(خالد عبادی)

دوستوں روشنی کے لئے کچھ کرو
وہ چراغ تعلق بجھانے کو ہے(سراج اجملی)

ماند سی پڑ رہی تھی پھر سچ کے نگر کی روشنی
سر کا چراغ ہم نے کل پھر سرِ دار رکھ دیا(نیر عاقل)

جینے کی خواہش، روشنی کی طلب، چراغ عزم کے لو کی سلامتی، رشتۂ ضاں بنائے رکھنے کی فکر، گمان کو یقین میں بدلنے کا اضطراب اور نئے اردو فکشن میں دلت، خواتین اور اقلیت کے مسائل، ظلم و جبر کے خلاف آوازیں یہ سب کچھ ترقی پسند احساس وشعور کا دوسرا نام ہے ۔ جہاں مارکسزم و سوشلزم کا دور دور تک نام نہیں ۔ یہ سب ہیومنزم کے حوالے سے ہے یا کسی بھی حوالے سے اس لئے کہ حوالے یا نظریے سے نیا فنکار کتراتا ہے اور نقاد اسے اور بھی گمراہ کر دیتا ہے۔لیکن ایک نئے نقاد کا یہ خیال بہر حال غور طلب ہے:

> ''آج ہمارے ادب میں سب کچھ ہے۔ زندگی کا نوحہ ہے۔ حالات کا شکوہ ہے۔ سیاست کا جبر ہے۔اعلیٰ اقدار کا ماتم ہے۔ تعصب کی شکایت ہے لیکن وہ بصیرت نہیں ہے جس کے زور پر زندہ قومیں وقت سے لوہا لیتی ہیں اور ہمارے ادیبوں کے پاس دنیا جہان کا سارا سامان موجود ہے پر وہ بے باکی نہیں ہے جس کے ہوتے ایک ریڈیکل تھنکر دور ہی سے پہچان لیا جاتا ہے۔''

بصیرت و بے باکی کا فقدان، صداقت کی کمی، جرائت و جسارت کی مجہولیت وغیرہ کی باتیں غور طلب ہیں اور بحث طلب بھی۔ کل ترقی پسند شاعروں و دانشوروں نے سرخئی لب رخسار کے ساتھ فرازِ رسن ودار کی بات کی تو اسے سطحی نعرہ بازی یا کوری خطابت وغیرہ کہہ کر اسے غیر ادبی قرار دیا گیا، لیکن جب جدید نقادوں و شاعروں کو

صداقت، حقیقت، بصیرت کی باتیں کرتے دیکھتا ہوں اور اسی کو ادبی قدر کا اعتراف کرتے دیکھتا ہوں تو یقین ہونے لگتا ہے کہ ادب اور زندگی کی بہر حال کچھ دائمی قدریں ہوا کرتی ہیں جنھیں کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان سب کے پیچھے زندگی کا اعلیٰ مقصد اور مقدس پیغام پوشیدہ رہتا ہے جو شعر و ادب میں اپنے ڈھنگ و طریقہ سے نمو پاتا ہے۔ ترقی پسند نقادوں و دانشوروں نے کبھی بھی فن و ادب کی اعلیٰ قدروں اور اس کے جمالیاتی تقاضوں سے انکار نہیں کیا البتہ ان قدروں کے تصورات پر کھلی بحث کی اور ہونی بھی چاہئے۔ ترقی پسند ادب کی تاریخیت و مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اسے ایسے نقادو دانشور ملے جنھوں نے ادب اور زندگی، ادب اور تہذیب کے رشتوں پر صد ہا صفحات رقم کیے۔ اعتراضات وحملوں سے کبھی گھبرائے نہیں، بلکہ ہر اعتراض کا معروضی انداز سے جواب دینے کی کوشش کی اور تنقید کو فکر ونظر کا دبستان بنا دیا۔ آج نئے ادب میں جو ترقی پسند احساس وشعور موجزن ہے ظاہر ہے کہ ان کو ترقی پسند تحریک سے الگ کرکے دیکھ پانا ممکن نہیں۔ یا بالکل اسی طرح جیسے ترقی پسند تحریک کو حالؔی، اقبالؔ، پریم چندؔ، جوشؔ وغیرہ سے الگ کرکے دیکھ پانا ممکن نہیں۔ ادب تاریخی تسلسل، سماجی نشیب وفراز اور انسانی پیچ وخم وکیف وکم کے بطن سے ہی جنم لیتا ہے۔ اسی سے وابستہ یہ سوالات بھی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کہ انسانی حیات کے اس زم گرم سفر میں، بشریت کی اس جدو جہد میں، اقتدار کی کشا کش غرضیکہ انسانی اجتماع کے منظر نامہ میں ادبیت کا رول کیا ہے۔ اس کی ذمہ داری کیا ہے۔ ادیب کا سماجی منصب اور اس کی سماجی وابستگی کیا ہے۔ وہ بھی اسی تقلید وتخریب کا حصہ ہے۔ ظلم وستم کا حصہ ہے یا اس کو صرف مسرتوں سے ہی کام ہے۔ ان سوالات اور زمانہ کی سمت و رفتار کی سمجھ ہی بصیرتوں کے در کھولتی ہے۔ بقول شاعر:

اس آنکھ سے وابستہ ہے توقیرِ بصیرت
وہ آنکھ جو رفتارِ جہاں دیکھ رہی ہے (محمود احمد رمزؔ)

کبھی کبھی زندگی جدوجہد، سمت و رفتار میں ایک منزل وہ بھی آتی ہے جہاں صرف دیکھنا ہی نہیں اس سے جوجھنا بھی پڑتا ہے۔ فیضؔ نے کہا تھا:

> ''شاعر کا کام محض مشاہدہ نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد وپیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے۔ اسے دوسروں کو دکھانا اس کی دسترس پر اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔''

26.3.2 اردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک بیسویں صدی میں زبان ادب کی سب سے بڑی تحریک ہے لیکن ترقی پسند احساس وشعور تو ادب میں ہمیشہ سے ہی رہا ہے۔ مثلاً میرؔ کے یہ دو شعر دیکھئے:

نہ رکھ میرؔ ربط ان امیروں سے تو
ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

موسم آیا تو نخلِ دار پہ میرؔ
سرِ منصور ہی کا بار آیا

مزاحمت اور جرائت سے پُر ان اشعار کے علاوہ چند اشعار اور دیکھئے۔۔۔

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دارورسن کی آزمائش ہے(غالبؔ)

لکھتے رہے جنوں کی حکایتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے(غالبؔ)

خنجر کہیں چلے پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے(امیر میناؔئی)

اردو کی کلاسیکی و قدیمی شاعری میں ایسے باغیانہ، جرات مندانہ اور صوفیانہ طرز کے اشعار کی کمی نہیں لیکن ان کا تعلق اس نوع کی ترقی پسندی سے نہ تھا جو ترقی پسند تحریک کی خصوصی دین تھی۔ تاریخی و سماجی حوالوں سے ایسا ممکن بھی نہ تھا۔ یہ ترقی پسندی یا روشن خیالی تو اس رواداری و انسان دوستی کا حصہ تھی جو ابتداء سے ہی اردو شاعری کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی لیکن اس کی جڑیں مذہب اور تہذیب میں پیوست تھیں۔ سردار جعفریؔ نے اسے ایک طرف بھگتی تحریک اور دوسری طرف یورپ کے مسٹی سزم (MYSTICISM) سے وابستہ کیا ہے۔ اردو شاعری اور شاعروں کی تو ابتدا سے ہی زاہد خشک، ناصح اور محتسب سے ٹھنی رہی ہے اسی نے آگے چل کر انسانی وحدت کے گیت گائے اور انسانی عظمت کے بھی اور چونکہ اس وقت تک سماجی اور مادی شکل وہ نہ رونما ہوئی تھی جسے بعد میں اقبالؔ جیسا مذہبی فکر رکھنے والا شاعر بھی اپنا بغیر نہ رہ سکا۔ اس لئے ان شعرا کی آوازیں وحدت وعظمت کے نغموں تک محدود رہیں تاہم ان کی افادیت اور عظمت سے انکار ممکن نہیں۔ اس روایت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ کل کی حقیقت آج میں اور آج کی حقیقت کل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ماضی کے کندھے پر بیٹھ کر حال اپنے کو یوں بڑا سمجھنے لگتا ہے جیسے باپ کے کندھے پر بیٹھ کر بیٹا اپنے آپ کو باپ سے بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ غالبؔ کا دارو رسن ہی ترقی پسند شعرا کے یہاں مختلف استعاراتی نظام میں جھلکا۔ مثلاً مجروحؔ نے کہا:

قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دارورسن تک ہے

یا فیضؔ کا یہ شعر:۔

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

حالیؔ، شبلیؔ وغیرہ سے ہوتے ہوئے جب یہ سلسلہ اقبالؔ تک پہنچتا ہے تو ان کی نظم نگاری انیسویں صدی کا نچوڑ اور بیسویں صدی کا شعور بن کر ابھرتی ہے اور کئی رنگ ایک ساتھ ابھرتے ہیں روایتی تصوف نے باعمل مردِ مومن یا

مرد کامل کی شکل اختیار کی۔ بیسویں صدی کے انقلابات وتحریکات نے ایسے اشعار بھی کہلائے:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میّسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبالؔ پہلے شاعر ہیں جن کے یہاں باقاعدہ انقلاب کی گونج سنائی دیتی ہے۔اسی طرح پریم چند کا سیدھا سادہ انسان پہلے وطن پرستی کا راستہ اختیار کرتا ہے اس کے بعد اخلاقیات کے حوالے سے ''بڑے گھر کی بیٹی'' و''نمک کا داروغہ'' جیسی کہانیاں لکھتا ہے اس کے بعد تحریک آزادی سے وابستگی اور گاندھی جی کی دوستی نے اور آگے بڑھا کر حقیقت اور اشتراکیت کی کہانیاں لکھوائیں۔''نئی بیوی'' ''نجات'' اور''کفن'' جیسی شاہکار کہانیاں۔۔۔۔اور کہانی پہلی بار سرمئی ماحول اور گلابی محل سے نکل کر پگڈنڈی، چوپال، کھیت اور اوسارے میں آئی اور ہندوستانی دیہات کی ارضیت اور ثقافت نے ایک نئی جمالیات کو پیش کیا۔ نتیجاً پورا اردو ادب قدامت اور جدیدیت کے دوراہے پر آ کھڑا ہوا۔کشمکش کے درمیان سجاد ظہیر دنیا کی سیاست اور اشتراکیت کی حقیقت لئے ہوئے ہندوستان کے ادب میں داخل ہوئے۔ترقی پسند اور روشن خیال ادیبوں اور شاعروں کی انجمن بنائی''انجمن ترقی پسند مصنفین''اور واضح طور پر اعلان کیا۔

''اس وقت ہندستانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور جاں بلب رجعت پرستی جس کی موت لازمی اور یقینی ہے اپنی زندگی کی مدت بڑھانے کے لئے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ پرانی تہذیبی ڈھانچوں کی شکست و ریخت کے بعد سے اب تک ہمارا ادب ایک گونہ فراریت کا شکار رہا ہے اور زندگی کے حقائق سے گریز کر کے کھوکھلی روحانیت اور بے بنیاد تصور پرستی میں پناہ ڈھانڈ رہا ہے جس کی باعث اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہو گیا ہے اور ادب شدید قسم کی ہیئت پرستی اور گمراہ کن منفی رجحانات کا شکار ہو گیا ہے۔ ہندستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھر پور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔

ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان رجعت پرست طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں ڈھکیل دینا چاہتے ہیں۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔''

ہر چندہ اس اعلان نامہ پر پریم چند، عبدالحق، جوش اور حسرت جیسے اکابرین ادب نے دستخط کئے اور بعد میں اقبال اور ٹیگور جیسے عظیم شاعروں اور دانشوروں نے بھی اس موقف کی حمایت کی لیکن سچ یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ اعلان نامے آئے اور یہ انجمن قائم ہوئی اور وہ انسانی تاریخ کا ایک نہایت پر آشوب زمانہ تھا۔ جہاں ایک طرف عالمگیر کساد بازاری کی وجہ سے ہندستان کی نو آبادیاتی بُری طرح متاثر تھی وہیں دوسری طرف

سامراجیت اور مذہبیت نے ایسا ماحول بنا رکھا تھا کہ عقل پرستی اور روشن خیالی کی گنجائش کم کم ہی تھی۔ اس کا ہنگامہ ''انگارے'' کی شکل میں رونما ہو چکا تھا اس مجموعہ میں شامل ترقی پسند و جرات منداد یبوں کو نہ اس وقت کوئی ندامت تھی اور نہ ہی بعد میں جب ان پر مقصدیت، افادیت، خطابت اور نعرے بازی کے حوالے سے طرح طرح کے الزام لگائے گئے لیکن سچ یہ ہے کہ بڑا ادب اور بڑا ادیب اکثر ناہموار ماحول میں ہی پیدا ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی بنیاد بظاہر ناہموار ماحول میں پڑی لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ پودا تھا جو مناسب موسم میں مناسب ہاتھوں کے ذریعہ لگایا گیا اور یہ مناسبت صرف ہندستان تک محدود نہ تھی اگر چہ یہ ایک تاریخی حیثیت ہے کہ اس تحریک کی نشو نما میں تحریک آزادی کا بڑا رول رہا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے ڈانڈے دنیا بھر کی تحریکوں سے بھی ملتے ہیں حقیقتاً یہ ایک راہگیر جدوجہد کا حصہ تھی۔ پوری دنیا کی عوامی طاقتیں ظلم اور فسطائیت کے خلاف پرچم بلند کر رہی تھیں ایسے میں ساری دنیا کے ادیب، فنکار، دانشور قلم اور قدم کے ساتھ ان کی ہم نوائی کر رہے تھے۔ جولائی 1935ء میں پیرس میں ہونے والی ادیبوں کی عالمی کانفرنس میں ادب و کلچر کے تحفظ کے لئے برطانیہ، یورپ، روس کے ادیبوں نے ایک ساتھ قدم اٹھائے اور ساری دنیا کے ادیبوں کو بیدار کیا۔ قلم کے تحفظ کے لئے اُٹھ کھڑے ہونے کی اپیل کی تھی۔ ایسی صورت میں خیالی، تفریحی اور مصنوعی ادب کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔عوام سے وابستگی، ان کی دکھ درد میں شرکت نے بہت کچھ بدلا، زندگی کے پامال موضوعات کی طرف سب کی نگاہیں اُٹھنے لگیں۔ مزدوروں اور کسانوں کی حمایت ہونے لگی۔ انقلاب کی آوازیں گرم ہونے لگیں۔ اشتراکیت نے حقیقت کا تصور تو بدلا ہی حسن کا معیار بھی بدلا جیسا کہ پریم چند نے کہا اور پھر سجاد ظہیر نے یہ کہا:

> ''ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قلم کی روشنائی خشک نہ ہو، ہمارے موضوعات ادب میں باسی پن نہ آئے۔ ہمارے ذہن اور فکر کو روز نئی غذا ملتی رہے تو ہمیں اپنا راستہ عوام سے جوڑے رکھنا چاہیے۔ محنت کش اور متوسط طبقہ کی سماجی زندگی سے بہتر اور کوئی موضوع ادب کے لئے ممکن نہیں''۔

میکسم گورکی نے بھی کہا تھا:۔

> "The richest treasure house of language is to be found in the speach of simple people among the folk lore and stories of the people. There is to be found the greatest anrichment of language and litrature."

راست طور پر عوام سے رشتہ کرنے کی وجہ سے عوامی مسائل آئے۔ عوامی موضوعات جس سے اردو ادب تقریباً نابلد تھا، ادب عالیہ کا حصہ بننے لگے۔ بدصورتی میں حسن تلاش کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مشکل عمل تھا۔ ایک طرف صدیوں کی روایتی جمالیات سے انحراف کرنا اور دوسری طرف کھردری جمالیات کو پیش کرنا جس سے اردو کا قاری واقف اور مانوس نہ تھا اس کے باوجود یہ ہوا کہ بدصورت اور غریب دھنیا اردو ناول کی تمام خوبصورت ہیروئینوں کو روند کر لازوال کردار بن گئی جس نے اور آگے بڑھ کر رانو، شمن، لاجونتی، سوگندھی، ثریا جیسے لافانی کردار دیے۔ اسی طرح ہوری سے لے کر دادر پُل کے بچے اردو ناول کے زندہ جاوید کردار قرار پائے۔

اردو ادب کو کھوکھلی رومان پرور دنیا میں رومانوی حقیقت یا حقیقی رومانویت کے بادل منڈرائے اور اردو شاعری کا محبوب و معشوق جو چلمن کی آڑ سے جاگیردارانہ تہذیب کی زوال پذیر صورتِ حال کو کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا اچانک اپنے آپ کو تمام قید و بند سے آزاد کر کے پہلے جنگل کی شہزادی بنا، پھر فتنہ خانقاہ اور اس کے بعد سماج کے دوسرے شعبوں میں جا کر دفتر، اسکول، کھیت، چوپال میں رچ بس گیا۔ مجاز نے تو پرچم انقلاب اُٹھا لینے کے لئے کہا:۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اور کیفی نے کہا:۔

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے دلچسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے اک چیز جوانی ہی نہیں
اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
توڑ کر رسم کے بت بند قدامت سے نکل
ضعفِ عشرت سے نکل وہم نزاکت سے نکل
نفس کے کھینچے ہوئے حلقۂ عظمت سے نکل
قید بن جائے محبت تو محبت سے نکل
راہ کا خار ہی کیا گل بھی کچلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

غرضکہ اشتراکیت نے پیر پھیلائے۔ حقیقت بے باک اور تہہ دار ہوئی اور پھر یہ فلسفہ بھی سامنے آیا کہ حقیقت جتنی تہہ دار ہوگی جمالیات اتنی ہی نازک ہوگی۔ ان سب نظروں میں اکتلاف و اتفاق کے معاملات اُبھرنے ہی تھے کہ روایتی اور فرسودہ نظام تبدیلیوں کو آسانی سے قبول نہیں کرتا لیکن ترقی پسند ادیبوں کا اعلان تھا کہ وہ تبدیلی پر یقین رکھتے ہیں اور یہ تبدیلی اپنے آپ نہیں ہوا کرتی بلکہ اس کے پس پردہ جدلیاتی مادیت کا نظام کام کرتا رہتا ہے۔ اسی لئے ترقی پسند ادیب اپنے آپ کو سماجی ذمہ داری بھی مانتے ہیں۔ تاہم ان کا ایقان تھا کہ وہ فن، حسن اور افادیت تینوں کے ساتھ لے چلیں گے اور چلے بھی۔ جنھوں نے ترقی پسند عشقیہ و رومانی شاعری کا مطالعہ نہیں

کیا وہ بیگانہ محض ہیں بے خبر بھی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ترقی پسند شاعروں نے سماجی شاعری اور احتجاجی شاعری پر زور زیادہ دیا اور بحث وتمحیص سے یہ نتیجہ بھی برآمد کیا کہ لمحاتی شاعری بہر حال مبہم شاعری سے بہتر ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہے بقول ایلیا اہرن برگ کہ اگر اس مخصوص لمحہ میں ملک وقوم کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا ہو تو لمحاتی شاعری بھی دائمی شاعری بھی شانہ بشانہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ سردار جعفری نے بھی کہا تھا:

''ہمیں اس شاعری کی بھی ضرورت ہے جو ایک وقتی لمحہ کی ضرورت کو پورا کر رہی ہو اور اس شاعری کی بھی جو لمحاتی اور وقتی سطح سے بلند ہو کر دائمی قدر کی حیثیت بھی حاصل کر سکے۔۔۔ ہر شاعر کی شاعری وقتی ہوتی ہے ممکن ہے کوئی اور اسے نہ مانے لیکن میں اپنی جگہ یہ سمجھتا ہوں۔ اگر ہم اگلے وقتوں کا راگ الاپیں گے تو بے سرے ہو جائیں گے، آنے والے زمانے کا راگ جو بھی ہوگا وہ آنے والی نسلیں گائیں گی، ہم تو آج ہی کا راگ چھیڑ سکتے ہیں''۔

ترقی پسند ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے تنظیم وتحریک کی مسلسل کانفرنسوں، رسالوں، بحثوں وغیرہ کے ذریعہ اپنے لائحہ عمل اور فکر ونظر کو بار بار واضح کیا۔ احتشام حسین نے کہا: ادب میں ترقی پسندی زندگی کی ترقی پسندی سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے اپنے ابتدائی اور انقلابی مضمون میں کہا'' زندگی کے مقاصد سے ہٹ کر ادب نہ اپنی منزل تلاش کر سکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے۔۔۔ایک انسان اور ایک ادیب کے فرائض و مقاصد یکساں اور مشترک ہیں''۔ مجنوں گورکھپوری نے ادب اور مقصد کے حوالے سے کہا ''بغیر مقصد کے کسی زمانے میں کوئی بھی ادب پیدا نہیں ہوا۔ بے مقصد ادب کا وجود کم سے کم ہماری گردو بار کی دنیا میں کبھی نہیں رہا''۔ مثالیں اور بھی ہیں مثبت، مدلل اور مستحکم۔ چنانچہ انہیں نظریوں کی بنیاد پر ہم عصر مسائل سے راست طور پر وابستگی، واشگاف حقیقت نگاری اور پامال موضوعات کی نمائندگی ہی ترقی پسند ادب اور ادیبوں کی سب سے بڑی دین ہے۔ جس نے نظریۂ ادب ہی نہیں نظریۂ حیات بدل کر رکھ دیا۔ یہ ترقی پسند ادیب ہی تھے جنھوں نے موت میں بھی تجدید حیات اور خزاں میں تجدید بہار کے خواب دیکھے اور دکھلائے اسی لئے ترقی پسند شعر و ادب میں یاسیت وقنوطیت کے بجائے امید ونشاط اور حیات افروز عناصر بھرے ہوئے ہیں۔ فیضؔ کی زنداں نامہ ہو یا علی سردار جعفریؔ کی پتھر کی دیوار۔ مخدومؔ کی حویلی ہو یا مجازؔ کی آوارگی یا ساحرؔ کے چھلکے۔ ان سب میں رجائیت ہے ایک مخصوص حرکت وحرارت۔ سردار جعفری صاف طور پر کہتے ہیں:

''میں اپنی شاعری کو ''نالۂ نیم شبی'' اور ''آہ سحر گاہی'' نہیں بنا سکا ہوں۔ میں اسے بیک وقت ستار کا نغمہ اور تلوار کی جھنکار بنانا چاہتا ہوں۔۔۔۔ میں اپنی نالہ وبکا آہ وفریاد سے اس غموں سے بھری ہوئی دنیا کو اور زیادہ غمگین نہیں بنانا چاہتا۔ ترقی پسند طاقتوں کا تقاضا یہ ہے کہ فضا کو زہر سے صاف کر کے پاکیزہ کر دیا جائے آج یہ شاندار جدوجہد دنیا کے ہر ملک میں ہو رہی ہے اور اس نے ساری دنیا کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے''۔

''شاعر کا کام محض مشاہدہ نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گردوپیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر اس کے بہاؤ میں داخلِ انداز ہونا اس کے شور کی صلابت پر اور لہو کی حرارت پر''۔

یہ تھے وہ افکار ونظریات جس نے ترقی پسند تحریک کو جلا بخشی اور اردو ادب آسمان سے اُتر کر زمین پر آ کھڑا ہوا۔ اب زمین کے اور عام انسان کے جو بھی مسائل تھے وہ ترقی پسند ادب کے مسائل تھے۔ معاملہ جنگ کا ہو یا ظلم کا۔انقلاب کا ہو یا احتجاج کا۔کلرک کا ہو یا چپراسی کا مزدور کا یا کسان کا۔ ترقی پسند ادیبوں نے ان سب کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا چنانچہ ''کالو بھنگی'' اور ''منگو کو چوان'' جیسے لافانی کردار ترقی پسند ادب کی تاریخ کا حصہ بن گئے اور بھی بہت کچھ ہوا۔ بقول پروفیسر قمر رئیسؔ:۔

''حقیقت یہ ہے گزشتہ چالیس سال میں ترقی پسند ادیبوں کے ہاتھوں اردو شعر و ادب کی مختلف اصناف میں جو وسعت، تازگی اور رنگا رنگی پیدا ہوئی، مشاہدہ و تخیل کی جو گہرائی اور نیرنگی آئی جو جاندار تجربے ہوئے وہ ملک کے عوام کی زندگی سے اسی قربت کا نتیجہ ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں نے حقیقت نگاری کا جو تصور پیش کیا اس میں زندگی اپنی ساری گہما گہمی، تہہ داری اور تنوع کے ساتھ ایک کل کے طور پر سمٹ آئی ہے۔ اس سے اردو شعر و ادب میں نئی سمتوں اور نئے امکانات کے دروازے کھل گئے''۔

سجاد ظہیرؔ اور دیگر ترقی پسند ادیبوں و دانشوروں کی یہ کوشش بھی تھی کہ اس تحریک کے ذریعہ اردو زبان کے ہی نہیں بلکہ ہندستان کی دوسری زبانوں کے ادیبوں و دانشوروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ ہر چند کے مذہبوں اور طبقوں میں بٹے ہوئے ہندستان میں یہ ایک بے حد مشکل اور پیچیدہ کام تھا تاہم ان سب کی غیر معمولی کوششیں ان کے بڑے مقاصد نے ہندستان کی دیگر زبانوں کے ادیبوں کو ایک مقام و محاذ پر متحد کر دیا۔ جس سے ادبی، لسانی جغرافیائی تفریق کی حدیں ٹوٹیں لیکن ان کی سب سے بڑی مشکل اردو زبان و ادب کو لے کر ہی تھی اس پر مدتوں سے امراء وشرفاء نوابین وسلاطین کا قبضہ تھا۔ متوسط طبقہ سے بالعموم اور نچلے طبقہ سے بالخصوص کوئی رشتہ نہ تھا لیکن سجاد ظہیرؔ اور ان کے رفقاء کی انتھک کوششیں اور سب سے بڑھ کر ملک ملت کے مسائل ایک بڑے طبقے کے ترجمان اُن کا رستہ دیکھ رہی تھی۔ اردو کے مسلم ادیبوں نے ہندو کردار پیش کئے نیز تیوہاروں اور دیوی دیوتاؤں پر سنجیدہ اور عمدہ نظمیں کہیں اور کہانیاں لکھیں۔ اردو افسانے کے جاندار اور شاندار نسوانی کردار بھی مردوں نے ہی خلق کئے ہندو ادیبوں نے مسلم کردار اور مسلم تیوہاروں پر بھی تخلیقات پیش کیں۔ ایک نیا مشترکہ کلچر پورے قومی اتحاد کے ساتھ پروان چڑھا جس نے ایک نئی عوامی، تہذیبی، ثقافتی دنیا کو جنم دیا۔

حیرت انگیز بات یہ بھی ہے کہ اس تحریک کی پہلی کھیپ میں زیادہ تر ایسے ادیب و شاعر تھے جو ان گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے جس کا نچلہ طبقہ سے تعلق نہ تھا لیکن ان کے سامنے اقبالؔ اور پریم چندؔ تھے۔ پریم چند بطور خاص ان کے آدرش چنانچہ جیسے ہی ان سب نے پریم چند سے رابطہ قائم کیا اور تنظیم کی بات کی۔ پریم چند نے فوراً کہا:۔

''ہم اس تنظیم کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ زندہ تابندہ ہو۔ ہمیں اصل میں ایسے ہی ادب کی ضرورت ہے اور ہم نے یہی آدرش اپنے سامنے رکھا ہے''۔

سچ یہ ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے پریم چند جیسے عظیم فنکار کو بھی نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان کی فکر میں انقلاب برپا کیا۔ انگارے کی اشاعت کے بعد پریم چند کے آخری دور کے افسانوں میں جس طرح اشتراکی عناصر آنے لگے

ہیں وہ اصلاً ترقی پسند تحریک کی ہی دین تھے۔ اقبال نے بھی مارکزم کی حمایت کی اور مارکس پر باقاعدہ نظم کہی۔ حسرتؔ موہانی بھی فروشانہ انداز سے تحریک سے وابستہ رہے۔

ترقی پسند تحریک کی اپنی کچھ کمزوریاں بھی تھیں جس کا اظہار مخالفین نے تو بار بار کیا ہی خود ترقی پسند ادیبوں و نقادوں نے کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا ہے کہ محاسبہ کرتے رہنا بھی ترقی پسند فکر کا ایک اہم جزو تھا۔ ممتاز حسین، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری وغیرہ کے متعدد مضامین ترقی پسند فکر و نظر کا محاسبہ کرتے ہیں۔ سجادؔ ظہیر قدم قدم پر اس کی وضاحت کرتے ہیں:۔

> ''یہ ادب کی ایسی تحریک ہے جس کی بنیاد حب الوطنی، انسان دوستی اور آزادی پر ہے۔ اس کا مقصد ہرگز ہمارے پرانے تمدن اور اخلاق اور ان کے ادبی یا فنی مظاہروں کو مسترد کرنا نہیں ہے''۔

انسان کی طرح تحریکوں کی بھی عمر ہوا کرتی ہے۔ عملی طور پر تحریک اور اس عہد کے ترقی پسند ادیبوں کو جو رول ادا کرنا چاہئے تھا انھوں نے ادا کیا۔ 1985ء میں لندن کی گولڈن جبلی کانفرنس میں میں نے ممتاز ترقی پسند دانشور و فلاسفر سبطِ حسن سے سوال کیا کہ کیا اب بھی ترقی پسند تحریک کی ضرورت ہے؟ کہا۔۔۔۔نہیں! تحریک اپنا کام کر چکی اب ترقی پسند نظریہ ادبی فضا میں تحلیل ہو چکا ہے۔ یہ جو نیا ادب ہے جو بظاہر ہو رہا ہے یہ دراصل ترقی پسند فکر و نظر کی توسیع ہے۔ بات کل کی نہیں آج بھی ترقی پسند تحریک کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ اپنی بات کہنے کے بجائے میں ایک ایسے جدید نقاد کی رائے پر اس مختصر سے مقالے کو ختم کرتا ہوں جو فکری اعتبار سے ترقی پسند نہیں ہے۔ ڈاکٹر یعقوب یاور اپنی بحث طلب کتاب ''ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری'' میں لکھتے ہیں:۔

> ترقی پسند تحریک کی بدولت شاعری کے مواد اور موضوعات میں رنگا رنگی کے آثار پیدا ہوئے۔ اس عہد میں اردو شاعری میں بہ لحاظ تعداد جتنے تجربے ہوئے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے۔ آج اردو نظم کی جو صورت متعین ہوئی ہے اس کی نقش گری میں ترقی پسند تحریک کا بھی حصہ ہے۔ نظم کو مقبول بنانے میں اس تحریک نے جو خدمات انجام دی ہیں ان سے انکار حقائق سے انحراف کے مترادف ہوگا۔ اردو نظم اپنے وجود کی نئی صورت گری اور ارتقاء کی رفتار میں تیزی کے لئے ہمیشہ ترقی پسند تحریک کی احسان مند رہے گی''۔

26.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے:

1۔ ترقی پسند تحریک سے متعارف ہوئے۔

2۔ ترقی پسند تحریک کے سفر کا جائزہ لیا۔

3۔ اردو ادب پر پڑنے والے ترقی پسند تحریک کے اثرات کی جانکاری حاصل کی۔

4۔ ترقی پسند ادیب وشعرا سے متعارف ہوئے۔

26.5 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ ترقی پسند تحریک کب شروع ہوئی؟

2۔ ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں کے نام بتائیے؟

3۔ اردو ادب پر پڑنے والے ترقی پسند تحریک کے اثرات بتائیے؟

26.6 سوالوں کے جوابات

1۔ ترقی پسند تحریک1936ء میں باقاعدہ شروع ہوئی جب سجاد ظہیر نے لکھنؤ میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا اور وہاں پریم چند نے اپنا خطبہ صدارت پیش کیا۔

2۔ ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں میں سجاد ظہیر، احتشام حسین، محمد حسن، حسن عسکری، قمر رئیس، سبط حسن، سردار جعفری، کیفی اعظمی، مخدوم محی الدین، عصمت چغتائی وغیرہ خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

3۔ اردو ادب پر پڑنے والے ترقی پسند تحریک کے اثرات کے عنوانات یہ ہیں:

ادب برائے زندگی، حقیقت نگاری، احتجاج، استحصال کے خلاف آواز بلند کرنا، سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت و بغاوت وغیرہ۔

26.7: کتب برائے مطالعہ

1۔	روشنائی	سجاد ظہیر
2۔	تاریخ ادب اردو	سیدہ جعفر
3	ترقی پسند ادب	سردار جعفری